فارسی و اُردو کی چند کمیاب کتابیں

کتاب خانۂ دانش گاہ دہلی میں

از

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۴)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان بابت ماہ نومبر ۵۹ء

مقدمہ سفرنامہ ناصر خسرو از الطاف حسین حالیؔ

بہر حال وہ سنہ ۴۴۱ھ میں مصر سے واپس ہوا اور تیسرا حج ادا کرنے کے بعد حجاز و یمن کے اطراف کی سیر کرتا رہا۔ وہاں سے لحسا، بصرہ اور خلیج عجم ہوتا ہوا پارس اور وہاں سے خراسان پہنچا۔ سنہ ۴۴۴ھ میں وارد بلخ ہوا۔

سفرنامہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم موصوف آتے جاتے وقت دو مرتبہ عراق عرب سے گذرا لیکن اس نے یہ تصریح نہیں کی کہ وہ عتباتِ عالیہ، کربلا و نجف اور کاظمین کی زیارت کو بھی گیا تھا یا نہیں یہ بات ایک ایسے شخص سے خصوصاً بہت بعید ہے جو خود کو خانوادۂ نبوت کا دل دادہ بتاتا ہو۔ غالب یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان مقدس مقامات کی زیارت تشیع یا تفضیل کی علامت سمجھی جاتی تھی اس لئے اگر کوئی عترتِ رسولِ مقبول سے عقیدت رکھنے والا اُن کی زیارت کا قصد بھی کرتا تو ہرگز اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ تاکہ وہ اُن ذی اقتدار لوگوں کے شر سے محفوظ رہ سکے جو حُبِّ اہلِ بیت کے آثار مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آج تک ہمارے برادرانِ اہلِ سنت و جماعت اگرچہ دور دراز کی منزلیں طے کر کے اولیائے امت کی زیارت کے لئے جاتے ہیں لیکن وہ ہرگز سفرِ عراق کی عادت نہیں رکھتے بلکہ اسے شیعوں کی خصوصیت ہی سمجھتے ہیں۔

سیر و سیاحت کا شوق | بہرکیف مذکورہ بالا بیانات سے اُس کی سیر و سیاحت کی مدت سات سال ہوتی ہے اور جیسا کہ سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے اس تمام سفر کے آنے جانے میں کل مسافت ان اسفار کو چھوڑ کر جو اس نے اطراف و جوانب کی زیارت کے لئے کئے انگریزی حساب سے سات ہزار میل ہوتی ہے۔ اس میں حکیم نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں جن کا برداشت کرنا ہر انسان کے بس کا نہیں اور جب ان راستوں کی دشواریوں کا، خصوصاً اس زمانے میں، تصور کیا جاتا ہے تو امروز و دوش کا فرق معلوم ہوتا ہے اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگلے زمانے میں کیسے اولوالعزم اور باہمت جواں مرد، ملتِ اسلامیہ میں پیدا ہوتے تھے اور وہ سیر و سیاحت کے کتنے حریص تھے۔ کہتے ہیں کہ مغرب کے باشندوں نے ممالک بعیدہ کا سفر کرنا اور سفرنامے لکھنا مسلمانوں ہی سے سیکھا ہے لیکن آج اس بات پر کوئی یقین بھی نہیں کرے گا کیوں کہ اُن تمام سہولتوں کے باوجود جو خشکی اور سمندر کے راستوں پر سفر کرنے کے لئے یورپ کی ایجادات نے مہیا کردی ہیں۔ آج مسلمانوں، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ بے خبر اور تنگ دائرے میں محدود رہ کر اپنے وطن سے محبت کرنے والی کوئی دوسری قوم نہیں۔

مصر کی طرف | صاحب روضۃ الصفا اور حبیب السیر نے تو یہ لکھا ہے کہ ناصر خسرو نے اسماعیلیہ کے حسن سیرت کا شہرہ سن کر مصر کا قصد کیا تھا لیکن اس نے اپنے سفرنامے میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی یہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ زمانہ کے خوف سے اس نے سکوت اختیار کیا ہو کیوں کہ تمام اہلِ سنت اور شیعہ، فرقۂ اسماعیلیہ کو گمراہ فرقوں میں شمار کرتے تھے اور مصر کے خلفاء کو، جو اس فرقے کے ائمہ تھے پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اُن پر فسق اور کفر کا فتویٰ عائد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ حکیم ناصر خسرو تین سال تک مصر میں رہا اور یہ ارادہ رکھتا تھا کہ ساری عمر وہیں گزار دے لیکن اس نے پورے سفرنامے میں کہیں یہ اظہار نہیں کیا کہ اس کے لئے وہاں کیا کشش تھی۔

اسماعیلیہ تحریک کا مقصد | یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ فاطمی خلفاء کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ اپنے اقتدار و عظمت کا سایہ ایشیا کے ممالک پر ڈالیں اور خلفائے بغداد کی عظمت و صولت کو مشرق

والوں کے دلوں سے متاثر کرا نھیں اپنی طرف مائل کر لیا۔ خصوصاً مستنصر باللہ جو ساٹھ سال تک مسندِ حکومت پر بیٹھا رہا چوں کہ اُسے اپنے پیش رو خلفاء سے زیادہ مہلت اس ارادے کی تکمیل کے لئے ملی اس لئے برابر اس کی طرف سے مبلغ اور جاسوس ان ممالک میں جاتے رہتے تھے۔ تاکہ لوگوں کو مذہب اسماعیلیہ کی طرف بلائیں اور مصر کی حکومت کو مذہبی لباس میں رونق بخشیں۔ آخر کار مستنصر کی یہ کوششیں بغداد میں بساسیری[1] کے توسط سے اور خراسان میں حسن بن صباح[2] کے وسیلے سے اس طرح بار آور ہوئیں کہ ہر شخص نے اسے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا۔

حکیم کے سفرِ مصر کا راز اس لئے یہ احتمال ہے کہ حکیم ناصر خسرو کو اس عظیم مقصد کی تکمیل کے واسطے انتخاب کر کے مصر میں بلایا گیا ہو جو خلفائے مصر سے نسبی قرابت بھی رکھتا تھا اور عقیدے کے لحاظ سے بھی خاندانِ نبوت کا شیفتہ و دلدادہ تھا۔ اور علم و فضل کے علاوہ اس نے امورِ مملکت میں بھی کافی درک حاصل کر لیا تھا۔ اور مدت دراز تک آلِ سلجوق کے دربار میں دیوانی کے اہم کاموں کی انجام دہی اس کے ذمے رہ چکی تھی۔ چناں چہ اپنے بعض قصائد میں جہاں اس نے سفر کی روداد بیان کی ہے یہ بھی لکھتا ہے کہ ممالکِ مغرب کا سفر اختیار کرنے کی وجہ صرف مستنصر باللہ سے ملاقات کا اشتیاق تھا اور کچھ نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مذکورہ قصیدے کا مفہوم ملخص کر کے یہاں درج کر دیں جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے: "ہجرت کے تین سو چورانوے (۳۹۴) سال گذرے تھے جب مادرِ مشفق نے مجھے زمین پر پہنچایا اس وقت

---

[1] بساسیری، بہاء الدولہ دیلمی کے غلاموں میں سے ایک غلام تھا بڑا بہادر اور باہمت۔ جس نے مستنصر باللہ کی اعانت سے قائم بامر اللہ عباسی کو ایک سال تک قید میں رکھا اور حکم دیا کہ بغداد میں مستنصر باللہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ (حالی)

[2] حسن بن صباح اسماعیلیہ گروہ کا سب سے بڑا مہرہ تھا جو مستنصر کی خلافت کے آخری ایام میں (سنہ ۴۷۱ھ) مصر پہنچا اور مستنصر کی ناک کا بال بن گیا۔ اس کی وفات کے بعد تمام بلادِ عجم میں گھومتا رہا اور لوگوں کو نزار ابن مستنصر کی امامت قبول کرنے کی دعوت دی اس نے عراق اور آذربائیجان میں ایک بڑی جماعت کو اسماعیلی مذہب کا پیرو بنا لیا اور اپنے چیلوں کی ایک پارٹی کو قلعۂ الموت اور قہستان کے نواح میں اس مذہب کی اشاعت کے لئے بھیجا۔ آخر کار تمام بلاد رودبار اور قہستان وغیرہ پر اپنا تصرف کر لیا یہاں تک کہ تقریباً سَو سال اسماعیلیوں کی حکومت ان علاقوں پر جاری رہی۔ ۶۵۴ھ میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے اس حکومت کا قلع قمع کیا۔ (حالی)

میں بے شعور تھا اور اُس سبزے کی طرح تھا جو شفاف پانی اور سیاہ مٹی سے اگتا ہے پھر نباتات کے درجے سے ترقی کرکے مرتبہ حیوانی میں داخل ہوا اور کچھ دنوں تک بے بال و پر پرندے کی طرح رہا یہاں تک کہ چوتھی حالت میں آگیا اور ناطقہ نے میرے جسم مکدر میں حلول کیا اور اب انسان ہونے کے آثار ظاہر ہوئے۔ جب میری عمر ۴۲ سال کی ہوتی اور میں نے اپنے آپ کو سب سے بہتر پایا تو اپنے دل میں کہا کہ ایسی شخصیت کی تلاش[1] کرنی چاہیئے جو تمام مخلوق سے برتر ہو جیسے پرندوں میں باز، پرندوں میں اونٹ، درختوں میں کھجور اور جواہرات میں یاقوت ہوتا ہے یا جیسے کتابوں میں قرآن ممتاز ہے، عمارتوں میں کعبہ، اعضائے بدن میں دل، اور ستاروں میں خورشید۔ چناں چہ اپنے مستقر سے اُٹھا اور سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اپنے گھر کو، اپنے چمن کو، اور وطن کے مناظر کو یاد نہیں کیا۔ اور اپنی احتیاج کو پارسی، تازی، ترکی، سندی، ہندی، رومی، عبری، فلسفی و مانوی اور صابی و دہری ہر ایک کے سامنے پیش کیا اور بار بار سوال کیا۔ بارہا مجھے پتھر کا بچھونا اور تکیہ بنانا پڑا اور کئی بار ایسا ہوا کہ بادلوں کو اپنا خیمہ و چادر سمجھا۔ کبھی ایسی سرزمین پر جا نکلا کہ وہاں پانی سنگِ مرمر کی طرح منجمد تھا کبھی بلند و بالا پہاڑوں کا سینہ روندتا ہوا گذر گیا کبھی شتربان کی طرح "ریسمان در گردن" گھوما، کبھی اونٹ کی طرح "بار بر دوش" اسی طرح ایک شہر سے دوسرے میں، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پوچھتا گچھتا اور ڈھونڈتا بھالتا، چلتا رہا۔ بعضوں نے کہا کہ شریعت عقل سے قائم نہیں ہوتی کیوں کہ اسلام نے تلوار کے زور سے قوت حاصل کی ہے[2] لیکن میں نے اُن کی تقلید میں اس بات کو قبول نہیں کیا اور دلیل و برہان سے قطع نظر نہیں کی کیوں کہ حق، محض تقلید سے میسر نہیں ہوتا۔ بہر حال

---

[1] "امام زماں" کی جستجو مراد ہے۔ (حالی)

[2] یہاں حکیم نے سلطنت غزنویہ اور سلاجقہ پر چوٹ کی ہے جنھوں نے قہر و استیلا سے حکومت حاصل کی تھی ان کے برخلاف مصر کے علوی بادشاہ تھے کہ وہ اپنے عقیدے اور رحم و انصاف کے اعتبار سے تمام سلاطینِ اسلام میں امتیاز رکھتے تھے۔

(حالی)

جب خدا چاہتا ہے کہ اپنی رحمت کا دروازہ کھولے تو تمام دشواریاں آسان ہو جاتی ہیں
۔ بارے میں ایک ایسے شہر میں جا نکلا کہ وہاں اجرام فلکی بندہ و چاکر تھے اور سارا آفاق مسخر تھا۔[1]
وہاں کے صحرا، دیبا کی طرح پُر نقش ونگار تھے اور وہاں کا پانی کوثر کی طرح صاف و شیریں تھا
اس شہر کے منازل سوائے علم وفضل کے اور اس باغ کے صنوبر سوائے عقل و خرد کے نہ تھے
وہ ایسا شہر تھا کہ وہاں کے حکما سب کے سب حریر و دیبا پہنتے تھے فقہائے خراسان کے مانند
پشمینے کے لباس سے جسم نہ ڈھانپتے تھے۔ جب میں اس شہر میں وارد ہوا تو میری عقل نے کہا کہ
آ اور اپنی مراد طلب کر لے اور یہاں سے کہیں جانے کا ارادہ نہ کر۔ میں اس شہر کے پاسبان[2] کے
پاس گیا اور اپنا راز بیان کیا۔ اس نے کہا غم نہ کر۔ یہ شہر چرخ بریں ہے جو بلند ستاروں سے
بھرا ہوا ہے بلکہ بہشت بریں ہے جو نازک اندام حسینوں سے مملو ہے۔ میں نے کہا کہ میرا نفس
ضعیف اور بے جان ہو چکا ہے میری رنگت کی سرخی اور قوی کی مضبوطی پر نظر نہ کرو۔ میں بغیر
دلیل و حجت کے دوا نہیں کھاتا اور درد سے اندیشہ نہیں کرتا۔ اور "قولِ منکرو" سنتا نہیں۔
اُس نے کہا اندیشہ نہ کر یہاں میں طبیب ہوں۔ اپنی بیماری میرے سامنے تفصیل و تشریح سے
بیان کر۔ میں نے اول و آخر علت و معلول اور جنس و صنعت و صورت اور قادر، تقدیر اور
مقدر کے بارے میں سوالات کئے۔ جب اس عقل مند انسان نے میرے سوال سنے تو اقرار کا
ہاتھ اپنے سینے پر رکھا (خدا کی رحمت ہو اس ہاتھ پر اور اس سینے پر) اور کہا کہ ہاں میں حجت
و برہان کے ساتھ دوا دوں گا لیکن تمہارے لبوں پر محکم مُہر لگا دوں گا۔ پھر اُس شربت پر جو اس نے
مجھے دیا انفس و آفاق سے دو گواہ حاضر کئے۔ میں نے اس دوا کو قبول کر لیا۔ اور اس نے میرے
لبوں پر سخت مُہر لگا دی۔ اور روزانہ بتدریج میری حاجت کا ازالہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میری
مشتِ خاک کو یاقوت کی طرح منور کر دیا۔ اب میں یاقوت ہوں اور میرا آفتاب وہ ہے جس

---

[1] اس شہر سے ملکِ مصر مراد ہے جہاں مستنصر باللہ حاکم تھا۔
[2] شہر کے پاسبان سے مراد مستنصر باللہ ہے۔ (حالی)

کی شعاعوں کے نور سے یہ تاریک دنیا روشن ہے۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شہر جس کا ایسا پاسبان ہو اور بڑی مبارک ہے وہ کشتی جس کا لنگر ایسا ہو۔ اے وہ شخصیت کہ تو علم کا مجسمہ، فضل کا پیکر، اور حکمت کا دل ہے۔ انسانیت کا ثمرہ اور نازش کا افتخار ہے۔ میں جو جامۂ پشمیں اور جسم لاغر اور رنگِ زرد کے ساتھ تیرے سامنے حاضر ہوں، خدا گواہ ہے کہ حجرِ اسود اور "خاک درِ پیمبر" کے بعد میں نے تیرے ہاتھوں کے سوا کسی شے کو بوسہ نہیں دیا ہے اور آج کے بعد جب تک زندہ رہوں گا اور جہاں کہیں بھی رہوں گا، سوائے تیرے شکریئے کے قلم، دوات اور کاغذ سے کچھ کام نہ لوں گا۔"

قصیدے سے استنباط اس قصیدے کے بیان سے چند نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ناصر خسرو نے فی الواقع، مستنصر باللہ کے حسنِ سیرت کا آوازہ سن کر سفرِ مغرب کا قصد کیا تھا اور وہ خراسان کے طرزِ حکومت نیز وہاں کے علماء کے طور طریق سے نفرت کرتا تھا۔ اور اپنے فضل و کمال اور بزرگی و سیادت کے بقدر اپنے احترام کی توقع اہلِ وطن سے نہ رکھتا تھا اور مستنصر باللہ نے ملاقات کے وقت جو کچھ باتیں اس سے کیں وہ ایسے رازہائے سربستہ ہیں کہ حکیم انھیں افشا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ نیز اس قصیدے سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ مستنصر کی زیارت کرنے سے اس کا مقصد صرف اکتسابِ سعادت اور تحقیقِ راہِ حق، اور بعض مذہبی گتھیوں کو سلجھانے اور قلب کے بعض وسوسوں کو دور کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جب ہم سفرنامہ میں یہ دیکھتے ہیں مصر سے واپسی کے وقت حکیم موصوف نہایت تنگ دست تھا یہاں تک کہ راستے میں چند جگہ وہ دوسروں کی امداد کا محتاج ہوا تو لازمی طور سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس دور و دراز سفر سے اس کا مدعا جاہ و دولت کی طمع نہ تھی اور بہت سے قصائد جو اس نے مستنصر باللہ کی تعریف میں لکھے وہ اُن قصائد سے مختلف ہیں جیسے چاپلوس اور خوشامد پیشہ شعرا اہلِ دنیا کے تعلق میں لکھتے ہیں بلکہ اُس کے تمام مدحیہ قصائد سے جو اس نے آخری سانس تک مستنصر کی تعریف میں لکھے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ نہایت صدق و یقین اور بے حد خلوص و ارادت کے ساتھ مستنصر کو ایسا امام مانتا تھا جس کی اطاعت فرض ہو۔

اہلِ خراسان کی مخالفت | حکیم کی سرگذشت اس وقت سے کہ اس کا سفر تمام ہوا اور اس زمانے تک جب خراسان کے لوگوں نے اس پر زندقہ والحاد کا الزام لگایا اور اس کے پیچھے پڑ گئے اور وہ وہاں سے بھاگ کر کوہستانِ بدخشاں میں پہنچا، سب پردۂ اختفا میں ہے۔

اگرچہ حکیم کے بعض واقعات کی نسبت ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سفر مغرب اور جلاوطنی کے بعد پیش آئے ہوں گے مثلاً بغداد، گیلان اور رستمدار میں آنا۔ اور ان شہروں کے علما سے مدت تک مناظرے کرنا اور واپسی کے وقت حضرت شیخ ابو الحسن خرقانی کی خدمت میں حاضر رہنا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے ایک بات بھی تحقیق کی نظر میں لائقِ اعتبار نہیں۔

بہرکیف، اہلِ خراسان کی مخالفت کا سبب بعض مورخوں نے یہ لکھا ہے کہ حکیم کی ایک کتاب ہے روشنائی نامہ جس میں آفرینشِ عالم، حقیقتِ روح اور اسرارِ تکوین وغیرہ کی بحث چھیڑی گئی ہے اور ایسی باتیں لکھی ہیں جن کے لکھنے والے پر زندقہ اور الحاد کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی۔ جب ہم اس کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں بھی اس قسم کی بہت سی چیزیں ملتی ہیں، ایک جگہ جسمانی حشر کو مستبعد بتاتا ہے، دوسری جگہ وضعِ کائنات پر نکتہ چینی کرتا ہے اس طرح جو کچھ وسوسے اور خطرے اس کے دل میں گزرتے ہیں بے تکلف اور بڑی بے باکی و آزادی کے ساتھ حوالۂ قلم کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جو لوگوں کی مخالفت کا سبب بن سکیں کیوں کہ ایرانی شعرا کی یہ سنتِ جاریہ ہے کہ وہ اکثر اوقات قانونِ شرع کے خلاف لکھتے ہیں اور "بے سُرے" الاپتے ہیں خدا سے اور اہلِ خدا سے شوخیاں کرتے ہیں لیکن چوں کہ اُن کے اکثر اقوال "عالمِ حال" سے نہیں ہوتے اس لئے اہلِ شرع انھیں ہزل پر محمول کرتے ہیں اور "یَقُولُونَ مَا لَا یَفْعَلُونَ" [وہ کہتے ہیں جو وہ نہیں کرتے] کے مصداق اُنھیں معذور سمجھ لیتے ہیں۔

(باقی)